ممتاز مفتی کے افسانوں میں صوفیانہ عناصر

Mysticism In The Short Stories Of Mumtaz Mufti

ساجدہ پروین
پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اردو، لاہور گریژن یونیورسٹی، لاہور

Sajida Parveen
Ph.D Scholar, Dept. of Urdu,Lahore Garrison University, Lahore

ڈاکٹر محمد ارشد اویسی
صدر شعبہ اردو، لاہور گریژن یونیورسٹی، لاہور

Dr. Muhammad Arshad Ovaisi,
Head, Dept. of Urdu, Lahore Garrison University, Lahore

Abstract

Mumtaz Mufti one of the famous urdu fiction writers. He has a glory of social topics in his literary work. He is among those people, who observed the society with depth. In his fiction we can see a variety of human behaviour with respect of the place and time. This article reflects the Sufism (Sufiana elements) in his short stories; so students of urdu can understand these elements in Mumtaz Mufti's short stories.

Key words: Gordaspur, Human behavior, Sufism, short stories, Mumtaz mufti

کلیدی الفاظ: گورداس پور، تصوف، عرفان اورروحانیت، ظاہر باطن، بنیادی خواہشات، مذہب، صوفی مفتی، پیراور فقیر

ممتاز مفتی کی پیدائش 12 ستمبر 1905 کو بٹالہ ضلع گورداس پور میں ہوئی۔ ان کا اصل نام مفتی ممتاز حسین تھا۔ ان کے والد کا نام مفتی محمد حسین تھا۔ آپ نے اپنی ابتدائی تعلیم مختلف شہروں سے حاصل کی جن میں ملتان، میانوالی، ڈیرہ غازی خاں شامل ہیں۔ انھوں نے ڈیرہ غازی خاں سے میٹرک اور پھر 1947ء میں امرتسر سے انٹر کا امتحان پاس کیا۔ 1929ء

میں اسلامیہ کالج لاہور سے بی۔اے کیا۔ آپ نے تدریس کا امتحان سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور سے پاس کیا۔ اس کے بعد آپ شعبہ تدریس سے 1936ء سے 1945ء تک وابستہ رہے اور پھر آپ اسی سال یعنی 1945ء میں آل انڈیا ریڈیو سے منسلک ہو گئے لیکن 1947ء میں آپ نے بمبئی کی فلم انڈسٹری کو خیر آباد کہا اور پاکستان واپس آکر اخبارات، ریڈیو، آزاد کشمیر اور فوجی ادارے میں ملازمت اختیار کر لی۔ اسی طرح 1951ء میں پاکستان حکومت کے محکمہ اطلاعات سے وابستہ ہوئے اور پھر مختلف عہدوں پر خدمات انجام دینے کے بعد 1966ء میں ریٹائر ہوئے۔ ممتاز مفتی اسلام آباد میں مقیم رہے۔ انھوں نے 2 اکتوبر 1995ء کو وفات پائی۔ آپ کی تصانیف میں افسانے، ناول، سفر نامے اور خاکے شامل ہیں۔

افسانہ آپا	(ان کہی 1943ء)
پریم نگر	(چپ 1947ء)
دودھیا سویرا	(گڑیا گھر 1965ء)
بت دیوتا اور سناٹا، ان پورنی	(روغنی پتلے 1984)،
ایک ہاتھ کی تالی، سیڑھی سرکار،	
گرداس، گرداس گرو،	
عینی اور عفریت	(سمے کا بندھن 1986)
پھیلاؤ کی زیریں چوہا، بوتل کا کاک،	
ممتا کا بھید معروف فارانی،	
دیکھن دکھن، کہانی کی تلاش	(کہی نہ جائے 1992)

ممتاز مفتی کی زندگی پر چونکہ ان کے والد کی گہری چھاپ تھی۔ آپ ابھی کم سنی میں ہی تھے کہ آپ کے والد نے دوسری شادی کر لی اور ممتاز مفتی کی والدہ اس غم میں دن رات جلنے لگیں۔ انھوں نے زیادہ تر اپنا رجحان پیروں اور فقیروں کی طرف کر لیا۔ اور اکثر وہ ممتاز مفتی کو بھی ساتھ لے جاتیں، لیکن بعض دفعہ تو ممتاز مفتی انکار کر دیتے اور بعض دفعہ ساتھ جانے کے لیے آمادہ ہو جاتے۔ اس طرح ان کے افسانوں کو تین دور میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔
اول: اس دور میں انھوں نے جو افسانے لکھے ان میں جنسی مضامین کو شامل کیا گیا ہے اور اس

میں عورت کی بے بسی اور لاچاری کا ذکر ہے۔ اس کے بعد دوسرے دور کے افسانوں میں انھوں نے تہذیب و اقدار کی پامالی، زمانہ قدیم اور جدید کے تصادم کے نقوش کھینچے ہیں۔ ان دونوں ادوار کے افسانوں میں چونکہ ممتاز مفتی کی اپنی زندگی کے ان مٹ نقوش ثبت کیے گئے ہیں۔ ممتاز مفتی پر بہت سا اثر ان کے والد کا تھا۔ اسی لیے انھوں نے چار شادیاں کیاں اور بہت سی عورتوں سے تعلقات بھی قائم کیے۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ جب انسان گناہوں کی دلدل میں گھیرتا چلا جاتا ہے تو ایک مقام ایسا ضرور آتا ہے کہ انسان ان سے اکتا کر کوئی ایسا سہارا ڈھونڈتا ہے جو اسے سکون میسر کرے۔ جس پر اس کا اپنا ضمیر مطمئن ہو۔ ممتاز مفتی کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔

انھوں نے بھی اپنا رخ تصوف کی طرف موڑا تو ان کے افسانوں میں متصوفانہ رجحانات نے جنم لینا شروع کر دیا، چنانچہ ان کے تیسرے دور کے افسانے ان کا مذہب سے لگاؤ اور تصوف کی طرف لوٹنے کے عمل کو ظاہر کرتے ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد ممتاز مفتی کے متصوفانہ افسانوں نے اردو ادب پر قابل ذکر اثرات مرتب کیے ہیں۔ ان افسانوں کا مختصر طور پر جائزہ درج ذیل ہے۔ لیکن اس سے پہلے یہ بات بتانی بے حد ضروری ہے کہ ممتاز مفتی پر قدرت اللہ شہاب سائیں اللہ بخش اور مذکرہ غوثیہ کے بھی اثرات ہیں۔ اس دور میں ممتاز مفتی کا زیادہ تر وقت خط و کتابت میں گزرتا۔ اس طرح مختلف صوفیا کرام سے بھی واسطہ پڑتا تھا۔ ممتاز مفتی اکثر و بیشتر بزرگوں کے مزاروں پر حاضری دینی شروع کر دی۔ اس طرح ان کی زندگی کا رخ آہستہ آہستہ ایک خاص سمت یعنی روحانیت کی طرف مڑنے لگا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر عارف اپنی تصنیف ممتاز مفتی شخصیت اور فن میں رقم طراز ہیں:

> "ان کے آخری دور کے افسانے تصوف سے ان کا لگاؤ اور مذہب کی طرف لوٹنے کا عمل ہے۔ ان کے کئی افسانوں میں مافوق الفطرت کردار واقعات اور عجیب و غریب صفات سے متصف یا بے مرکزی کردار ادا کرتے ہیں۔ ان کے مخصوص فکری رویوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔"(1)

جہاں صرف جنس کا تعارف اور موضوع ہر طرف لبریز تھا۔ اب اس دور میں یہ یکسر بدل چکا تھا۔ اب ان کے افسانوں میں بابے کے طور پر کردار اپنا رول پلے کرتے اور بعض دفعہ

افسانے کے ہیرو یا ہیروئن آہستہ آہستہ رومانیت کی منزلوں کی طرف سفر کرنا شروع کر دیتے تھے اور اسی منزل کو پانے کے لیے دن رات تگ و دو کرنا شروع کر دیتے اور راستے کی کسی مشکلات کی پرواہ نہ کرتے۔

فن افسانہ نگاری کے تقریباً مختلف عوامل ہیں۔ جن سے تصوف کے عوامل کو با آسانی شناخت کیا جا سکتا ہے۔ ممتاز مفتی نے بھی اپنے افسانوں میں تصوف کے عوامل کو مخصوص انداز سے پیش کیا ہے۔ ان کے اس دور کے افسانوں میں فرد اور معاشرے سے وقوع پذیر ہونے والے حادثے، ہونی اور ان ہونی کے قصے، ظاہر اور باطن کے تضادات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ان کے افسانہ وہ بت، دیوتا اور سناٹا میں ایسا منظر دیکھایا گیا ہے جس میں ضمیر اس شخص کو ملامت کرتا اور اس کو اسی کے گناہ یاد دلاتا ہے کہ وہ معصوم لڑکیوں کو کسی طرح جھوٹی محبت کا دلاسا دے کر انھیں بیوقوف بناتا اور پھر ان کا جب سب کچھ برباد ہو جاتا تو پھر قصوروار انھی کو سمجھتا ہے۔

کچھ ایسا ہی منظر اسی افسانے میں رقص کرتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ شخص ہر اس لڑکی کے پیچھے لگ جاتا جو جاذب نظر آتی۔ اس سلسلے میں اس نے اپنی بھابھی کو بھی نہیں چھوڑا پھر ہوا یہ کہ اس کا ضمیر خود اس کے سامنے کھڑا ہو گیا اور وہ آواز جس کو وہ ساری زندگی دباتا رہا، وہ اس کے غلط کارناموں سے تنگ آ گیا تھا اور پھر اس کے گناہ اسی کے سامنے بے نقاب کرنے لگا، لیکن وہ اپنے آپ کو معصوف سمجھتا ہے اور گناہگار سفینہ، آصفہ اور دوسری لڑکیوں کو خیال کرتا ہے، لیکن جیسے جیسے اس کا ضمیر اس کے گناہ کا پردہ اس کے سامنے کھولتا جاتا ہے تو وہ شرمندہ ہو کر سوائے سر جھکانے کے کچھ نہیں کرتا۔

اس افسانے میں کچھ ایسا منظر محسوس ہوتا ہے کہ ساری زندگی انسان سب کچھ جانتے ہوئے بھی ضمیر کو دبا کر اپنی خواہشوں کو پانے کی ترغیب میں لگے رہتے ہیں۔ لیکن جب اس کو ہوش آتا ہے تو اس وقت وہ سب مواقع ہاتھ سے جا چکے ہوتے ہیں اور سوائے شرمندگی کے کچھ ہاتھ نہیں آتا اور اس کو سزا سنائی جاتی ہے اور ہر طرف سناٹا چھا جاتا ہے۔ وہ بت دیوتا اور سناٹا سے اقتباس ہے کہ:

''عین اسی وقت ایک مہیب آواز آئی جیسے بادل کڑکتا ہے۔

> سر گوشی بند ہو گئی۔ سناٹا چھا گیا۔ چھائے رہا چھائے رہا صدیاں بیت گئیں سارا ماحول سہا ہوا تھا۔ بے حس و حرکت تھا، خاموش، منتظر۔ پھر ایک پُر ہیبت آواز آئی۔ ہم نے بندے تخلیق کیے تھے، لیکن وہ دیوتا بن بیٹھے۔ کیا ہمارے بندوں میں کوئی ایسا نہیں جو بندہ بن کر جیا ہو۔۔۔ بولو۔۔۔ جواب دو۔ جواب میں ایک گھمبیر سناٹا چھا گیا جو کائنات پر مسلط ہو گیا۔"(2)

ممتاز مفتی کے اس افسانے میں روحانیت کی کی ایک خاص صفت کو روشن کیا گیا ہے۔ جس میں جب انسان اس مقام تک پہنچ جاتا ہے تو اسے اس ختم ہونے والی فانی دنیا کے کھیل تماشے کی سمجھ لگ جاتی ہے اور اس کا ضمیر اسے ملامت کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اور وہ اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی خود کو اس دنیا میں محسوس نہیں کرتا، بلکہ اسے وہ تمام حالات دکھائی دیتے ہیں جو آنے والے یا اس کے ساتھ ہونے والے ہوتے ہیں، تاکہ وہ انجام سے پہلے اپنے گناہوں کا اتکاب کر کے سچے دل سے شرمندگی محسوس کرتے ہوئے اللہ کے حضور جھک کر معافی مانگے۔ اس دن سے پہلے کہ جب وہ مرحلہ آجائے کچھ بھی باقی نہ رہے گا بلکہ اللہ کے حکم سے سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ اور اس کا ضمیر اللہ کے حضور چلا چلا کر کہے گا کہ میں اس شخص کو سمجھاتا رہا ہوں لیکن اس نے کبھی میری بات نہیں سنی۔ اور اپنی انا اور میں کے ساتھ جیتا رہا، وہ اسی وقت چلا کر کہتا ہے یہ جرم میں نے نہیں کیا، لیکن اس کا ضمیر ایک تصویر کی مانند سارا کچھ اس کے سامنے رکھ دیتا ہے۔

بت دیوتا اور سناٹا کا آغاز ہی میں تجسس اور حیرانی کے الفاظ ملتے ہیں جیسے ترخ۔۔ ایک دھچکا لگا۔۔ جیسے کچھ ٹوٹ گیا۔۔ گرد و پیش کی آوازیں مدھم پڑتی گئیں۔ یہ افسانہ موت کا منظر اس کے بعد سوال و جواب جزا اور سزا اور دوبارہ ان گناہوں سے معافی کے خواہش مند شخص اپنی نا کے جنگل میں دنیا میں رہتے ہوئے اپنے خالق حقیقی کو بھول کر خود سمجھتا ہے کہ وہ ہی سارا کچھ ہے اور یہ کائنات اس کے تابع اور مطیع ہے اور جو مقصدِ حیات بھول جاتا ہے۔ جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق فرمائی۔ اسی طرح ان کے افسانہ ان پوانی میں بھی زندگی کے لمحات کو نقش کیا گیا ہے کہ جب آنند کمار بالکل بدل جاتا ہے بظاہر تو انسان زندگی گزارتا رہتا ہے، لیکن زندگی میں ایک موڑ ایسا ضرور آتا ہے جو اس کو یکسر بدل دیتا ہے۔

اور وہ ایسی منزل ہوتی ہے کہ اس کو پانے کے لیے وہ دنیا جہاں کو بھول کر بس اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہتا ہے۔ اسے کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ دنیا کیا کر رہی ہے۔ اس کے بارے میں کیا سوچتی ہے۔ اس کی اپنی بھی کوئی انا ہے یا اس کے اندر بھی "میں" موجود ہے۔ کچھ ایسا ہی آنند کمار کے ساتھ ہوا وہ ان پورنی کی دھوم سنتا ہے جو سُر کی دُھن میں ایسی کھو جاتی ہے کہ اسے ارد گرد کا کوئی ہوش نہیں رہتا۔ اسی بات کی وجہ سے وہ دوسروں سے جدا تھی۔ بس اس بات کو دیکھنے کے لیے جب آنند کمار ان پورنی کا رقص دیکھنے کے لیے اس کے کوٹھے پر جاتا ہے تو حیرانی کے عالم میں اس کے رنگ راگ کو دیکھتا اور محسوس کرتا رہتا ہے۔ لیکن اس کے بعد وہ گھر واپس تو آجاتا ہے مگر مکمل نہیں آدھا۔ وہ خود محسوس کرتا ہے کہ جیسے وہ اپنے وجود کا آدھا حصہ ان پورنی کے پاس ہی چھوڑ آیا ہو وہ اپنے آپ کو بہت سمجھاتا ہے لیکن ایک بے چینی اور اضطراب تھا کہ اسے کسی پل بھی سکون لینے نہیں دیتا تو وہ چہل قدمی کرنے لگتا ہے اور پھر آنند کمار اپنے نوکر سیوک ناتھ کو ان پورنی کو لانے کے لیے کہتا ہے لیکن جب ان پورنی آنند کمار کے محل میں آتی ہے، تو اس کی شان و شوکت اس پر کچھ اثر نہیں کرتی۔ وہ آنند کمار کے سامنے آکر آنند کمار کو سُر کی ڈھونڈ کے بارے میں بتاتی ہے۔ اور کہتی ہے کہ اس کا وجود آدھا ہے اور آدھا سر کی ڈھونڈ میں لگا ہوا ہے۔ اس وقت آنند کمار بہت غور سے ان پورنی کی بات سنتا ہے، اور چپ چاپ ان پورنی کے پاس بیٹھ جاتا ہے۔ کچھ لمحات اسی طرح گزر جاتے ہیں سیوک ناتھ اس کشمکش اور چپ سادھ بیٹھے ہوئے آنند کمار اور ان پورنی کو دیکھتا، لیکن کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکتا۔ اگلی صبح ان پورنی تو واپس آجاتی ہے لیکن آنند کمار اس سُر کی دُھن میں نکل کھڑا ہوتا ہے اور اسی دُھن میں وہ ان پورنی کو بھی بھولجاتا ہے بلکہ اسے کچھ یاد نہیں رہتا۔ متصوفانہ رجحان کا خوب صورت امتزاج ممتاز مفتی نے اس افسانے میں پیش کیا ہے۔ یعنی خدا کو ڈھونڈنا ہے تو خود کو جاننا اور ڈھونڈنا ضروری ہے کچھ ایسا ہی ان پورنی کے ساتھ ہوتا ہے وہ خود کو چھوڑ کر دربدر پھرتی ہے کہ شائد کہیں بھگوان اسے مل جائے لیکن چونکہ آنند کمار اس گہرائی کو جان جاتا ہے اور پورن یعنی مکمل چاند مکمل ہو جاتا ہے اور اپنی منزل حاصل کر لیتا ہے۔ افسانہ ان پورنی سے اقتباس ہے کہ:

"اس رات ان پورنی سوچوں میں پڑی رہی رو رو کر بے حال ہو گئی۔

بھگوان میں کیا کروں۔ کس کی ڈھونڈ کروں۔ پھر وہ مندر مند
ر پھری۔ دیوی دیوتاؤں کے چرنوں میں بیٹھ کر روئی، ہاہاکار کی ہے
دیوتا مجھے بھگوان کی ڈھونڈ دے دو۔"(3)

ان پورنی جب بھگوان کی ڈھونڈ میں مندر جاتی ہے تو مندر میں اس کے رکھوالے اس سے نگر نگر پھرنے کی وجہ پوچھتے ہیں لیکن ان پورنی کے جواب پر وہ مسکرا کر اسے کہتے ہیں کہ پہلے خود کو جانو اور سُر کو ڈھونڈنے کی بجائے سُر والے کو ڈھونڈ جس کو تم نے اس ڈھونڈ پر لگایا کچھ دنوں بعد آنند کمار اسی مندر میں آتا ہے، لیکن وہ ان پورنی کو بھلا چکا ہوتا ہے ان پورنی بہت جتن کرتی ہے اور اس کے نوکر سیوک ناتھ کی منتیں کرتی ہے کہ اسے ایک بار آنند کمار سے ملوادے، لیکن بے کار وہ اس تلاش میں بہت آگے جا چکا تھا۔ ان پورنی بہت روتی ہے لیکن مندر کا پجاری اس کو کہتا ہے۔ 'بیکار ہے پتری اب تیرے لیے وہاں کچھ نہیں۔ کیوں کہ تم نے اس پورن کو ان پورن بنا دیا۔ یعنی وہ تمھاری خاطر سُر کو ڈھونڈ تا رہا۔ اگر اس سے پہلے وہ اس کو اپا لیتی تو ٹھیک تھا لیکن اب اس نے اس سُر کے بھید کو جان لیا ہے، اور اس سُر نے اسے کسی اور ڈھونڈ میں لگا دیا ہے اور اب وہ اپنی منزل حاصل کرنے کے لیے اس ڈھونڈ میں لگا ہوا ہے۔'

اس افسانے میں مختلف منازل کا ذکر ہے روحانیت کی منازل اور پھر انسان ایسی منزل پا کر جب آخری منزل پر پہنچ جاتا ہے تو سوائے اس کو اللہ سے ملاقات کرنے کے کوئی چیز اہم نہیں۔ تو سوائے اس کو اللہ سے ملاقات کرنے کے کوئی چیز اہم نہیں لگتی۔ اس کو کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ نہ کوئی وعدہ نہ کوئی بات اور نہ کوئی فرد بس وہ تو اس منزل کے ختم ہونے کے انتظار میں ہوتا ہے، کہ کب اپنی منزل کے اختتام پر پہنچے اور اپنے مقصد کو حاصل کرے جس کے لیے اس نے ساری زندگی تگ و دو کی ہے۔ اس مرحلے پر وہ خود سے اور سری دنیا سے بیگانہ ہو جاتا ہے اور یہ عرفان اور روحانیت کی وہ منزل ہوتی ہے جس میں اسے ہر بات کے بارے میں یعنی غیبی چیزوں کے بارے میں علم ہونے لگتا ہے، اور اس کو لوگ بابا کے نام سے پکارنے لگتے ہیں۔ یہ بات اس مرحلے میں ہوتی ہے۔ آنند کمار بھی اس منزل تک پہنچ جاتا ہے کہ ہر کوئی اس سے ملنے کی خواہش رکھتا ہے لیکن اس کے دل میں کسی کے لیے کچھ نہیں ہوتا۔

ایک ہاتھ کی تالی میں ایک دربار جس میں دو قبریں ہیں اور ان کے درمیان میں ایک

درخت ہے۔ جس کا آدھا حصہ کیکر اور آدھا بیری کا تھا۔ ہر کوئی آکر اس معجزے کو دیکھ کر حیران ہوتا۔ اور پھر اس قدر مشہور ہوئے کہ لوگ منتیں ماننے لگے اور ایک حصہ پر پہلے اور دوسرے حصے پر سرخ رنگ کا کپڑا باندھ کر اپنی مرادیں مانگنے لگے۔ اس طرح یہ دونوں بابے محبت و عشق کے بابے کے نام سے مشہور ہوگئے۔ ان میں سے ایک کا نام کمال اور دوسرے کا نام جمال تھا۔ اور بابا کمال کے مزار پر عورتیں اور جمال کے مزار پر مرد آکر اپنی منتیں مانگتے تھے۔ یہ سب انکشاف اس ایک بوڑھی عورت نے کیا جو کہ ایک گھڑی قبروں کے درمیاں میں ٹیک لگا کر بیٹھی تھی۔

اس بوڑھی عورت کو اپنا پرانا گزرا ہوا ماضی یاد آتا ہے اور وہ اس شخص کو جواب دینے کی بجائے اپنے ماضی کو کھنگالنے لگتی ہے۔ یہ شخص ایک راہ گزر جب ان قبروں کے معجزے کو دیکھتا ہے تو پاس آکر حیرانی کے عالم میں دیکھتا رہتا ہے۔ اور اس کے اندر تجسس پیدا ہوتا ہے کہ آخر ان بابوں نے کون سے ایسے نیک اعمال کیے جس کی وجہ سے ان کا نام رہتی دنیا تک باقی رہ گیا ہے، اور یہ کوئی اپنی مرادیں لے کر آتا ہے وہ اس بوڑھی عورت سے پوچھتا ہے کہ آخر کیا معاملا ہوا کہ اللہ کو ان کے کمالات بہت پسند آگئے۔ کچھ دیر خاموشی ماحول پر طاری رہنے کے بعد وہ بوڑھی عورت بولی۔ اقتباس ہے:

> "یہ دونوں بابا لوگوں کا معجزہ ہے، کون بابا لوگ اس شخص نے دوبارہ سوال کیا۔ اس نے ہاتھ ہلا کر دونوں قبروں کی طرف اشارہ کیا۔ لیکن منہ سے کچھ نہ کہا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان قبروں کو دیکھتی رہی۔" (4)

میں نے ایک بازارو عورت جو کہ ایک شخص قاسم سے محبت کر بیٹھتی ہے، لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ قاسم صرف اسے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ می نے سردار بھائی کے کوٹھے پر رہتی تھی لیکن ایک دن کمال جو کہ ایک نواب زادہ تھا وہ می نے کی توجہ کا طالب تھا لیکن می نے کا فلسفہ یہ تھا کہ جیسے وہ خود کسی سے سچی محبت کرتی ہے اسی طرح وہ بھی کسی مفاد کے بغیر اس سے محبت کرے۔ کمال بہت بار می نے کو اپنے گھر بلاتا ہے لیکن صرف باتوں باتوں کی تکرار میں صبح ہو جاتی اور می نے واپس چلی جاتی تھی۔ ایک می نے کمال کو خط لکھتی ہے کہ اسے کسی کام سے جانا ہے لیکن وہ اپنی گاڑھی بھیجے اور وہ اس کے گھر پر نہیں آئے گی۔ اس بات پر

کمال کے دل پر بہت آگ جلتی ہے وہ بہت پریشان رہتا ہے لیکن پھر وہ می نے کی اس بات کو سوچتا ہے کہ محبت تو ایک ہاتھ کی تالی ہے۔ اس میں کوئی شکوہ شکایت نہیں ہونا چاہیے۔

چنانچہ وہ ایسا ہی کرتا ہے لیکن اس کے بعد وہ بے چین ہوتا اور بے چینی کے عالم میں گھر سے باہر گلی میں چکر لگانے لگتا ہے۔ اس کی نظر ایک نقاب پوش عورت پر پڑتی ہے جو دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ اس نے پاس آکر اس سے پوچھا کہا س کو مدد کی ضرورت ہے لیکن وہ تومی نے تھی۔ یہ دیکھ کر کمال کو حیرانی ہوتی ہے لیکن وہ اس سے پوچھتا ہے کہ کیا کہیں جانا ہے۔ اسے تومی نے نے بتایا کہ اسے اگلی گلی میں جانا ہے لیکن بارش کے باعث کیچڑ تھا تو کمال اسے اس کے گھر تک لے گیا جہاں وہ جانا چاہتی تھی۔ لیکن یہ کیا یہ تو اس کے دوست جمال کا گھر تھا وہ بہت پریشان ہوتا ہے۔ کمال اپنے وقار پر گھن دکھائی دینے لگتی ہے۔ ادھر جمال می نے سے پوچھتا ہے کہ وہ کس کے ساتھ آئی ہے تومی نے اسے کمال کے بارے میں بتاتی ہے۔ نواب زادہ کمال یہ سن کر جمال بھی حیران ہوتا ہے اور پھر کمرے سے باہر نکل جاتا ہے۔ یہ سب ماضی تھا لیکن انگولا سے واپسی پر وہ شخص دوبارہ مزاروں پر جاتا ہے تو اس عورت کو دیکھتا ہے۔ اسی لمحے اس کے دماغ میں ایک کرن پھوٹتی ہے اور وہ کہتا ہے۔ میں نے یہ سن کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بوڑھی عورت حیرانی سے اس شخص کو دیکھتی ہے تو اس نے کہا بیٹا کیا تم ابھی تک ایک ہاتھ کی تالی بجائے جا رہی ہو۔

ممتاز مفتی کے اس افسانے میں اضطراب بے چینی ہے لیکن اس کے ساتھ حقیقت سچائی اور محبت کمال اور جمال کو پیر و مرشد کا درجہ دے دیتی ہے اور پھر ہوا یہ کہ حالات بھی واضح ہونے لگے۔ یعنی وہ شخص کمال کی صورت میں اس کے سامنے آتا ہے اور کہتا ہے کہ کیا تم ابھی بھی ایک ہاتھ کی تالی بجائے جا رہی ہو، حالانکہ بہت کچھ بدل چکا ہے۔

''عینی اور عفریت'' ممتاز مفتی کے اس افسانے میں ''انا'' اور ''میں'' کی کشمکش و تضاد ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے کہ جب انسان اپنا تمام تر وقت اپنی مرضی اور ان دونوں کے احساس کے ساتھ گزارتا ہے۔ وہ ہر وقت اپنے ضمیر کو دبا کر اپنے ارادوں کو جامع عمل میں لانے کے لیے مصروف رہتا ہے اور اس کے لیے وہ جو بھی کام کرتا ہے۔ اسے کوئی غلط محسوس نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے وہ سب ٹھیک ہے اور باقی سارے غلط ہیں۔ لیکن

ایک دن ایسا ضرور آتا ہے کہ ضمیر اس کو اس کا اپنا چہرہ دکھانے پر تل جاتا ہے اور بار بار اسے ملامت کرتا اور بتاتا ہے کہ تم نے جو کیا وہ سب صحیح نہیں بلکہ خود غرضی اور انا پرستی ہے۔ اس میں کوئی مذہب کوئی تمیز کوئی حق نہیں ہے۔ یہی مرحلہ اس افسانے میں اس وقت آتا ہے جب ننھا منیر بے بسی کی تصویر بنا دیوار کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے۔ اور بوڑھی ماں سبزی بنا رہی ہوتی ہے وہ اپنے بیٹے کو بار بار کہتی ہے کہ کسی سے شادی کر کے لے آئے، تا کہ وہ ننھے منیر کا بھی خیال رکھے اور گھر کو بھی سنبھالے۔ اس بات پر کئی بار بحث ہو چکی تھی لیکن آج جب اس نے کہا کہ اماں میں ڈھونڈ رہا ہوں تو ماں بولی سامنے دھری نہیں دکھتی تو پھر ڈھونڈ سے کیسے دکھے۔ افسانہ عینی اور عفریت سے اقتباس ہے:

> "اماں کی بات میرا رستہ روک لیتی ہے۔ رک جاتا ہوں لیکن تڑپ بھری نگاہوں سے اسے دیکھتا ہوں کہ شاید وہ کوئی دلاسا دے مڑ کر دیکھے پھر مسکرائے پھر پھلجھڑی چل جائے پھر کُن کہہ دیا جائے۔"(5)

عینی اور عفریت میں ایک شخص کا ضمیر نے اس کو ملامت کر کے اس کی "میں" کو ختم کرنے کے لیے ماضی کی باتیں یاد دلاتا ہے۔ اور اس کی ماں کی بات جو کہ اسے ڈھونڈ سے روکنے کی کوشش کرتی ہے۔ اور اس کو آئینہ میں اس کی اپنی ہی عفریت سمجھاتی ہے، لیکن وقتی طور پر اس پر غصہ تو کرتا ہے اور اسے ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر ہر طرف اسے یہی عفریت دکھائی دیتی ہے اور وہ اس سے پیچھا چھڑوانے کی کوشش کرتا ہے لیکن ناکام۔ وہ سوچتا ہے کہ اس سے جسم کا ایک حصہ اس سے باغی ہو گیا ہے۔ اس لیے اس کو تنگ کر رہا ہے، وہ مختلف جگہوں سے بچتے ہوئے جب گھر پہنچتا ہے تو دیکھتا ہے کہ گھر میں بھی اس قسم کے حالات اس کو تنگ کرتے ہیں۔ لیکن ڈرائنگ روم میں اپنے دوست راجا کو دیکھ کر کچھ سکوں محسوس کرتا ہے لیکن اس وقت اس کے ساتھ ایک بوڑھا آدمی بھی بیٹھا تھا۔ راجا اس بوڑھے کو کہنے لگا ۔ باباجی میرے دوست کے لیے دعا کریں یہ آج کل پریشان ہے۔ اس نے پوچھا۔ اقتباس ہے:

> "کیا پریشانی ہے حاجی پوچھتا ہے۔ میں ایک الجھن میں ہوں، میں جواب دیتا ہوں۔ وہ یہ کہ میں کون ہوں، میرا مطلب ہے کیا میں وہ ہوں جو خود کو سمجھتا ہوں، یا وہ ہوں جو لوگ مجھے سمجھتے

> ہیں۔ حاجی نے جواب دیا، آپ اس جھنجھٹ میں کیوں پڑتے ہیں
> کہ آپ کیا ہیں، اپنی میں کا ،اپنی میں کا بوجھ کندھوں پر کیوں
> اٹھائے پھرتے ہیں۔ خوامخواہ۔"(6)

ضمیر جب اپنا کام دکھا دیتا ہے تو انسان کے لیے آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہ ہر وقت کوئی بھی کام کرنے سے پہلے سوچتا ہے کہ کیا اس میں کسی کی دل آزاری یا نقصان تو نہیں ہے، یا اس بارے میں اللہ تعالیٰ کی کوئی ناراضگی تو نہیں اور جو کام وہ کر رہا ہے۔ اس میں حقوق اللہ اور حقوق العباد شامل ہیں۔ جب یہ چیز پیدا ہو جاتی ہے تو "میں" یعنی انا پرستی ختم ہو جاتی ہے اور اس طرح جب یہ صفت پیدا ہو جاتی ہے تو رزائل اخلاق کی برائیاں ختم ہونے لگی ہیں۔ اور معاشرے میں مثبت سوچ پیدا ہونے لگتی ہے۔ اس طرح ایک انسان بدلنے سے معاشرتی برائیوں کا سدباب ہوتا ہے تو دوسری طرف وہ انسان فوراً تصوف کی سیڑھیاں چڑھنے لگتا ہے۔ اور اس کی آخرت بھی سنور جاتی ہے۔ ممتاز مفتی کے اس افسانے میں جب اس کے کندھوں سے "میں" کا بوجھ اتر جاتا ہے تو وہ دلی سکون محسوس کرتا ہے۔ اس طرح وہ بابا غیبی امداد کے لیے آتا ہے۔

کہی نہ جائے دیکھن دکھن 1992ء

اس افسانے میں ایک پنواڑی جو کہ چھابڑی لگانے کا کام کرتا تھا۔ یعنی قلفی بیچتا تھا وہ اپنا حال پوچھنے کے لیے جگن جوتشی کے پاس جاتا ہے اور کہتا ہے کہ کیا اس کی زندگی میں کوئی ایسی عورت آئے گی جو دکھتی ہو ویسی ہی ہو یعنی وہ ظاہر اور باطن میں ایک جیسی ہو۔ اس بات پر جوتشی حیران ہو کر اس سے پوچھتا ہے کہ وہ کیا کام کرتا ہے۔ تو وہ بتاتا ہے کہ وہ پہلے قلفی بیچتا تھا لیکن اب نہیں۔ پنواڑی جوتشی کو اپنی کہانی بتاتا ہے۔ کہ ایک ناٹک والی کماری کی آواز کا وہ دیوانہ ہو جاتا ہے پھر ناٹک کہیں اور چلا جاتا ہے۔ وہ ایک سال اس کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا، لیکن ایک دن ایک بنگلے سے اس گیت کی آواز آئی تو وہ کھڑکی سے کان لگا کر کھڑا ہو گیا اور بنگلے کے چوکیدار سے پوچھنے لگا کہ اس گھر میں کون رہتا ہے۔ تو اس نے بتایا کہ بنگلے کا مالک اور اس کی بیوی۔ پنواڑی اس کی منت سماجت کرنے لگا کہ ایک دفعہ اس سے ملاقات کروادے۔ وہ کچھ پیسے لے کر مان جاتا ہے۔ بیگم باہر آکر پوچھنے لگتی ہے کہ کون ہے تو اور کیا چاہتا ہے تو پنواڑی

اسے کہتا ہے کہ وہ اس کے گیت کا دیوانہ ہے اور منت کرتا ہے کہ ایک بار روز ضرور سنا دیا کرے۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ مان جاتی ہے۔ پنواڑی روز جاتا اور گیت سن کر واپس آجاتا۔ اور جب بنگلے کے چوکیدار کو پتا چلتا ہے تو وہ اسے لے کر کہیں اور چلا جاتا ہے۔ اس دن کے بعد وہ اس کی تلاش میں مارا مارا پھرنے لگا۔

جوتشی یہ بات سن کر بہت سنجیدہ ہو گیا اور وہ کہنے لگا۔ میں بھی وہ نہیں جو نظر آتا ہوں۔ میں بھی ایک محبت میں گرفتار رہا اور اس کو حاصل بھی کر لیا، لیکن وہ، وہ نہیں تھی جو دکھتی تھی۔ ایک دن چھوڑ کر کسی اور کے پاس چلی گئی اور میری حالت غیر ہونے لگی تو میری ماں ایک بابے کے پاس لے گئی اور کہنے لگی کہ یہ دربدر پھر رہا ہے اور میں نے اس کو روکا ہے لیکن یہ نہیں رکتا تو وہ کہنے لگا۔ اقتباس ہے:

> "نہ بی بی اس کو نہ روک اسے جانے دو تا کہ دیکھن دکھن کے چکر میں پڑا رہے۔ اور یہ ایک پردہ ہے جو ڈال ڈال، پات پات میں دکھتا ہے، جو ذرے، ذرے میں دکھتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ ہم اسے دیکھیں۔ اس لیے اس نے ہمیں دیکھن دکھن کے چکر میں ڈال رکھا ہے کہ ہمارا دھیان ادھر لگا رہے ادھر نہ جائے۔ اور اگر دیکھن دکھن کے چکر سے نکل جاؤ تو پھر کچھ بھی نہیں رہتا۔ نہ میں رہتا نہ تو۔ نہ دکھ نہ سکھ، نہ روشنی نہ اندھیرا، کچھ بھی نہیں رہتا نہ روشنی نہ اندھیرا، کچھ بھی نہیں رہتا صرف وہ رہ جاتا ہے صرف وہ۔"(۷)

اس افسانے میں اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی چیزوں کے بارے میں بہت باریکی سے بتایا گیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے کائنات میں یہ تمام حالات وواقعات اور چیزیں اس لیے بنائی ہیں تا کہ انسان کا دھیان اللہ سے ہٹا رہے۔ اور اللہ کی ذات ہر ذرے میں موجود ہے لیکن اس کا ظاہر اور باطن موجود ہے۔ اس طرح ہر فرد کا بھی ظاہر اور باطن ہے۔ جہاں بابا فقیر جوتشی کو سمجھاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سب اس لیے بنایا تا کہ اس کے اور کائنات کے درمیان جو پردہ حائل ہے وہ پردہ قائم رہے۔ یہ وجہ ہے کہ اس نے دیکھن دکھن یعنی ظاہر اور باطن کا ماحول پیدا کیا ہوا ہے۔ لیکن جب سب ختم ہو جاتا ہے یعنی دنیاوی خواہشات کو انسان ختم کر دیتا ہے۔ اس کے دل میں

چکر باقی نہیں رہتا تو صرف اللہ کی ذات باقی رہ جاتی ہے۔ اس انسان کو ہر طرف وہ ہی وہ نظر آتا ہے۔ جیسی حالت ولیوں کی ہوتی ہے اور یہ تصوف کی ایک اہم منزل ہے۔

(کہیں نہ جائے 1992ء) بوتل کا کاک

"بوتل کا کاک" ایک ایسا افسانہ ہے جس میں ایک لڑکی ایمی اس دنیا میں تو موجود ہے لیکن وہ دنیاوی خواہشات سے بے زار نظر آتی ہے۔ اسے جوان لڑکے لڑکیوں کی طرح شوخیاں اور چھیڑ چھاڑ پسند نہیں بلکہ وہ کچھ ہونے کے انتظار میں رہتی ہے۔ وہ روزمرہ مصروفیت سے بیزار ہے وہ ہر وقت سوچتی ہے کہ کچھ ایسا ہو جو کہ اس روٹین سے الگ ہو۔ کوئی ایسا طوفان ہو جو کہ اس کے اندر طوفان کے مشابہ ہو۔ اس کے اندر کے اس طوفان نے اس کو بہت بے چین کر دیا تھا۔ ایک دن وہ یونہی اسی انہونی کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ اسی لمحے اس کو ایک آہٹ محسوس ہوئی اس نے دیکھا تو ایک چہرہ نظر آیا۔ اس چہرے پر اس کو وہ ہی طوفان نظر آیا جو س کے اندر موجود تھا اور جس کی تلاش میں وہ بے چین تھی۔ اسی چہرے کی آنکھیں سرخ آگ کی طرح تھیں، مگر ان میں خوفناک نہیں بلکہ مستی کے جذبات نظر آرہے تھے۔ اس کو دیکھنے کے بعد ایمی کچھ دن بہت ڈری اور ہر وقت وہ چہرہ اس کے ذہن پر گردش کرنے لگتا۔ آہستہ آہستہ وقت گزرتا گیا اور ایمی اس چہرے کی تلاش میں وہ ماری ماری پھرنے لگی۔ اس نے ہر جگہ اس کو تلاش کیا مگر ناکام رہی۔ ایک دن اس نے اپنے گھر کے چوکیدار سے پوچھا اور اس چہرے کا سارا حلیہ بنایا۔ اسنے ہاں میں جواب دیا اور کہا کہ وہ فقیر تھا اور میں بھی اس کو دیکھ کر ڈر گیا تھا۔ پھر اس نے بتایا کہ وہ کسی قلندر کا بالکا ہو گا۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ ایمی کی ماں پہلے بھی پیروں فقیروں کے پاس حاضری دیتی تھی، مگر گھر میں سب اسی کا مذاق اڑاتے تھے کو د ایمی بھی اپنی ماں کو ان چکروں سے نکالنے کی کوشش کرتی۔ مگر اسی انکشاف کے بعد اس کا دل بار بار کہتا تھا کہ وہ بھی کسی قلندر کے پاس جا کر حقیقت تک پہنچے۔ اب اس کو یہ بات بھی معلوم ہو چکی تھی کہ قلندر کا بالکا صرف وہی ہو سکتا ہے جس پر قلندر کی خاص نظر ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ فیصلہ کرتی ہے کہ اب کی بار اپنی ماں کے ساتھ سیہون شریف جائے گی۔ ایمی کی ماں اس کے رویے کے بدلنے پر حیران تھی اس سلسلے میں افسانہ بوتل کا کاک سے اقتباس ہے:

"ایمی نے ماں سے پوچھا۔ امی! سیہوں شریف کا عرس کب ہو گا، تو
وہ حیران رہ گئی۔ اس لڑکی کو کیا ہو گیا ہے۔ یہ تو ان باتوں کا مذاق
اڑایا کرتی تھی۔"(۸)

ایمی سیہون شریف جا کر ان لوگوں کے بارے میں جاننا چاہتی تھی کہ واقع وہ لوگ کسی لگاؤ کے تحت جاتے ہیں ور وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ وہاں پر ان کی حالت کیسے غیر ہوتی ہے۔ اس نے اپنی ماں سے بہت سے واقعات سن رکھے تھے جو سیہون شریف کے عرس پر جاتی رہتی تھیں۔

سیہون شریف میں بہت سے لوگوں کو دیکھ رک ایمی بہت حیران ہوئی۔ اب اس کے اندر کا طوفان باہر آنا چاہتا تھا۔ وہ طوفان جس کو وہ ہر وقت محسوس کرتی تھی اور سوچتی تھی کہ ایسا ہی طوفان اس دنیا میں بھی آئے یہاں آ کر وہ بالکل اپنے دماغ کے عین مطابق محسوس کر رہی تھی۔ ایمی نے دیکھا کہ تمام لوگ ایک ہی دھن میں لگے ہوئے ہیں وہ اپنے پیر و مرشد کی نظر میں اچھا بننے کے لیے ایک دوسرے سے زیادہ لگن اور محبت سے جھوم رہے تھے۔ ایمی یہ سب کچھ محسوس کرتے ہوئے کچھ سوچنے لگی اور اس کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ قلندر کی نظر صرف اس پر ہے وہ اپنے آپ کو قلندر کا بالکا محسوس کرنے لگی اس کو ارد گرد کی کچھ خبر نہ رہی۔ اسے نہیں معلوم کہ کب اس کے اندر کا کاک یعنی طوفان دھماکے کی طرح پھٹا اور وہ بغیر مجمے کی پرواہ کیے ہوئے اپنے بالوں کو جھٹکے سے کھولتے ہوئے جھومنے لگی۔

یہ افسانہ یہاں پر ختم ہو جاتا ہے لیکن اس کے اندر بہت سی جگہ پر متصوفانہ نقطہ نظر سامنے آتے ہیں۔ خاص طور پر فقیر جو سرخ آنکھوں والا ہوتا ہے اور پھر ایمی کی والدہ کی سیہون شریف عرس پر جانے کی رغبت اور پھر ایمی کا عرس پر مدہوش ہو جانا۔ تصوف ایک ایسا نظریہ جو کہ نسل در نسل اور معاشرہ در معاشرہ اور مذہب در مذہب سفر کرتا ہے۔ اور یہ بات بھی حقیقی طور پر سامنے آتی ہے کہ کوئی نہ کوئی ایسا نقطہ ضرور ہوتا ہے جو کہ فرد کو تصوف کی طرف رغبت دلاتا ہے وہ دنیا میں رہتے ہوئے دنیاوی خواہشات و جذبات سے عاری بس اپنے اللہ کی اطاعت میں مصروف عمل رہتا ہے۔ ممتاز مفتی کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا چونکہ ان کے والد دنیاوی آدمی اور مذہب سے دوری رکھنے والا انسان تھا۔ جب کہ ان کی والدہ کے

اندر تصوف کی طرف رغبت موجود تھی۔ وہ ایک دین دار اور نیک خاتون تھیں۔ ممتاز مفتی کے والد نے چونکہ دوسری شادی کر لی تھی اس وقت ممتاز مفتی بہت چھوٹی عمر مین تھے۔ اس کا ان کی والدہ کو بہت دکھ تھا لیکن انھوں نے اپنے آپ کو مذہب تک محدود کر لیا تھا وہ جا بجا مزاروں پر بھی حاضری دیتیں اور اکثر ممتاز مفتی کو بھی حاضری دینے کے لیے کہتیں۔ لیکن ابتدائی عمر میں ممتاز مفتی اس کو محسوس کرنے سے قاصر تھے اور ان پر ان کے والد کا رنگ نمایاں تھا۔ وہ مختلف عورتوں سے جنسی تعلقات بھی قائم کرتے۔ انھوں نے چار شادیاں بھی کیں، مگر ہوا یہ کہ ایک دن ایسا آیا کہ ممتاز مفتی کی راہ بدل گئی۔ نہ صرف وہ خود بدلے بلکہ ان کی تحریروں نے نیا موڑ موڑا اور آنے والے ادیبوں کے لیے راہیں ہموار کر دیں۔ ممتاز مفتی کے آخری دور کے افسانے عموماً ان کی اپنی زندگی ہی کی تصویر نظر آتے ہیں۔ اور مذہب کا درس بھی مکمل طور پر روشن پہلوؤں سے دیتے ہیں۔

(سمے کا بندھن 1986ء) گر داس داس گرو

ممتاز مفتی اپنے افسانوں میں نہ صرف اسلام بلکہ دوسرے مذاہب میں بھی تصوف کی تصویر کو مختلف انداز سے پیش کرتے ہیں۔ گر داس، داس گرو جو کہ ان کے افسانوی مجموعہ سمے کا بندھن میں شامل ہے۔ اسی میں وہ ہندو مذہب متصوفانہ رجحانات کو اجاگر کرتے ہیں۔ اس افسانے میں مہاراج کی بیٹی بغیر سوچے سمجھے چلتی رہتی ہے۔ اس کی کوئی سمت کوئی منزل کوئی مقصد نہیں اور نہ وہ کسی کی بات سنتی ہے۔ اور نہ وہ محسوس کرتی ہے کہ کوئی اس کے بارے میں کیا سوچتا ہے وہ تو بس اپنی ہی دھن میں مدہوش چکر لگاتی رہتی ہے۔ مہاراج اور مہارانی اپنی بیٹی کی وجہ سے بہت پریشان ہوتے ہیں۔ اور وہ اس کے بارے میں مختلف لوگوں سے رائے بھی لیتے ہیں کہ انھیں کیا کرنا چاہیے چنانچہ وہ ایک سادھو بابا کے پاس جاتے ہیں کیونکہ ان کو امید تھی کہ وہ ضرور کوئی نہ کوئی حل بتائیں گے۔ سادھو بابا انھیں تسلی دیتے ہیں ایک دن مہاراج کو رنجنا یاد آ جاتی ہے۔ اس نے سوچا کہ وہ ضرور اس کی پریشانی حل کرے گی۔ وہ اس کو جا کر پوری کہانی سناتا اور بتاتا ہے کہ اس کی بیٹی ایک آشرم میں بھی جاتی ہے اور جوان لڑکے اور لڑکیاں وہاں جا کر دھن میں جھومتے ہیں۔ مہاراج اور رنجنا سادھو اور سادھنی کا روپ اختیار کر کے اس آشرم میں چلے جاتے ہیں اور اس کو داس سے ملاتے ہیں اور س سے گرو بننے کی بجائے داس

بننے کی وجہ پوچھتے ہیں تو وہ پھر بتاتا ہے کہ وہ گرو داس کا بیٹا ہے اور اس کے باپ نے ہی اس کو داس بنایا ہے۔ مہاراج اس کے باپ کے بارے میں پوچھتا ہے تو وہ اس کی ڈھونڈ کے بارے میں یعنی تلاش کے بارے میں بتاتا ہے کہ اس کے باپ نے قسم کھائی تھی جب تک وہ اپنے گرو کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر نہیں لائے گا اس وقت تک وہ واپس نہیں لوٹے گا۔ اس بات پر مہاراج کو اس تلاش کا علم ہو جاتا ہے جو کہ وہ اپنی بیٹی کے لیے تلاش کر رہا تھا۔ داس اس کو سمجھاتا ہے کہ یہ ایسا عمل ہے کہ جب تک اس شخص کی کھوج و تلاش مکمل نہیں ہوتی۔ اس وقت تک وہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کوشش جاری رکھتا ہے۔ جیسے کہ اس کے باپ نے کہا تھا اور اس مقام پر پہنچ کر وہ اور مَیں میں کوئی فرق نہیں رہتا گُرو، داس گرو سے اقتباس ہے:

> ''گرو داس واپس آ گیا تھا۔ وہ لوگ آشرم سے باہر آئے۔ سامنے بڑے درخت تلے ایک شخص بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے بڑھے گرو کو اپنی پیٹھ پر اٹھایا ہوا تھا۔ انھوں نے دیکھا کہ گرو کا دھڑ سوکھ کر چیلے کے گرد لٹکا ہوا ہے اور چیلے کا سر سوکھ کر گرو کی چھاتی پر لٹکا ہوا ہے، بھگوان کی لیلا ہے، داس بولا، جس چیز کو لوڑ نہ تھی وہ سوکھ کر جھڑ گئی۔ داس کا سر۔ گرو کا دھڑ، دو جسم ایک بن گئے اور گرو چیلے کا داس بنا گیا۔''(۹)

روغنی پتلے ممتاز مفتی کا پہلا افسانوی مجموعہ تھا۔ اس مجموعے میں ان کے کرداروں میں روحانیت کی جھلک نمایاں طور پر عیاں ہوتی ہے اور ان کے متصوفانہ رجحانات کھل کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اس مجموعے کو پڑھ کر اور ممتاز مفتی کے ابتدائی تحریروں کو پڑھنے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ جنس پر لکھنے والا ممتاز مفتی اور تھا اور اس کی جگہ مذہب پر لکھنے والا صوفی مفتی اور ہے۔ اس طرح اس سے یہ احساس ہوتا ہے کہ ممتاز مفتی نے اپنی تحریروں کی روشنی میں معاشرے کو مذہبی پیغام دینے کی کوشش کی ہے۔

حوالہ جات

1۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، ممتاز مفتی شخصیت اور فن، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، فاؤنڈیشن پریس، 2000ء، ص:92

2۔ ممتاز مفتی، روغنی پتلے، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 1984ء، ص:۷۶

3۔ محمد طفیل، نقوش، عصری ادب نمبر، لاہور: شمارہ129، ادارہ فروغِ اردو، ستمبر 1982ء، ص:

4۔ نجیبہ عارف، بکل دے وچ چور، ممتاز مفتی کے متصوفانہ افسانے، ایک ہاتھ کی تالی، لاہور: آر۔ آر پرنٹرز، 2012ء، ص:135

5۔ ممتاز مفتی، سمے کا بندھن، افسانے، کراچی: فیروز سنز، 1993ء، ص:92

6۔ نجیبہ عارف، بکل دے وچ چور، ص:172

۷۔ ممتاز مفتی، کہی نہ جائے، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۲ء، ص:۱۰۳

۸۔ ممتاز مفتی، روغنی پتلے، ص:۸۸

7۔ ممتاز مفتی، سمے کا بندھن، ص:۱۱۲